سیف الدین سیف

حسین یادیں

امرتسر اس زمانے میں شعر ادب کا گہوارہ تھا مولانا فیروز الدین طغرائی، مولانا عرشی، ڈاکٹر تاثیر، صوفی تبسم، ساحر، فیض اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری امرتسر میں ہی رہا کرتے تھے۔

یہ سب لوگ مولانا عرشی کے گھر میں اکٹھے ہوتے تھے۔ وہ گھر شعر و ادب کا مرکز تھا۔ حفیظ جالندھری بھی وہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ اسی طرح مجلس احرار اسلام کے ایک بہت بڑے رہنما شیخ حسام الدین تھے۔ ان کے گھر پر بھی شعر و ادب کی نشستیں ہوا کرتی تھیں وہاں بھی میں جایا کرتا تھا۔ باہر سے جب لوگ آیا کرتے تھے تو شعر و شاعری کا خوب چرچا ہوا کرتا۔ اس میں ان لوگوں میں مطالعے کا بڑا شوق تھا۔ جو نام لئے گئے ہیں یہ سب لوگ مطالعے کے بہت شوقین تھے اور یہ سب نہایت عالم فاضل لوگ تھے۔ فیض اردو کے بلند پایہ اسکالر تھے۔ عربی زبان نہ صرف جانتے تھے بلکہ بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ تاریخ، فلسفہ، ادب اور مختلف سیاسی و ادبی تحریکوں سے انہیں بہت زیادہ واقفیت تھی۔ فرانس، روس اور اسکنڈے نیوین ممالک کے ادب پر انہیں مکمل عبور حاصل تھا۔ ان کی شخصیت بہت سی چیزوں کا ایک حسین امتزاج تھی۔ اکثر یہ ہوتا تھا کہ کوئی نشست۔۔۔ ہوتی جس میں ڈاکٹر تاثیر، مولانا چراغ حسن حسرت، عطاء اللہ شاہ بخاری بیٹھے ہوتے تھے۔ اس زمانے میں ادب اور مذہب کوئی مختلف چیزیں نہیں تھیں۔ ادب کے لوگ مذہب سے بھی تعلق رکھتے تھے اور باقاعدہ مطالعہ کرتے تھے۔ علماء مثلاً عطاء اللہ شاہ بخاری کو اردو، فارسی کے ہزاروں شعر یاد تھے اور وہ اپنی تقریروں میں نگینوں کی طرح ان شعروں کو جڑ دیا کرتے تھے۔ جب دو گھنٹے کی نشست ہوتی تھی تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے علم کے دریا بہہ رہے ہیں۔ اگر کوئی آدمی اس میں شرکت کرتا تو وہ چاہتا تو بہت اچھی کتاب بھی مرتب کر سکتا تھا۔ میں اس لحاظ سے خوش نصیب ہوں کہ میں نے ان کی بہت زیادہ محفلوں میں شرکت کی۔ جب بھی یہ لوگ اکٹھے ہوتے تو کہتے تھے کہ سیف کو بلاؤ۔ اکثر یہ ہوتا کہ مولانا ہاشمی، ڈاکٹر تاثیر، مولانا حسرت، عطاء اللہ شاہ بخاری، فیض احمد فیض اور شیخ حسام الدین جب بھی امرتسر آتے تھے تو گروپ کی شکل میں آتے تھے۔ ان کی دو سے چھ گھنٹے تک ادبی نشستیں ہوتی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ اس قسم کی نشستوں سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا۔

میں نے جن بڑے آدمیوں کو قریب سے دیکھا ان میں ادب میں فیض صاحب، صوفی تبسم اور ڈاکٹر تاثیر صاحب تھے۔ لیڈروں میں شیخ حسام الدین اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی حیثیت اس زمانے میں یہ تھی۔ (میں ۳۹-۱۹۳۸ء کی بات کر رہا ہوں) کہ وہ مجلس احرار کا دور تھا اور خیال کیا جاتا تھا کہ برصغیر کی تاریخ میں اتنا بڑا مقرر کوئی نہیں گزرا جیسے مولانا تھے۔ ادب سے انہیں بڑا شغف تھا۔

عربی، فارسی اور اردو کے ہزاروں اشعار انہیں ازبر تھے۔ اپنی تقاریر میں اس طرح نگینے کی طرح شعر جوڑتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ اسی موقع کے لئے شعر کہا گیا ہے۔ میں اس وقت بچہ تھا لیکن چونکہ شعر اور سیاست کا بہت شوق تھا۔ اس لئے میں ان کا جلسہ سنے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس زمانے میں، میں نے کئی جلسے ایسے دیکھے کہ جہاں لاٹھی چارج ہونا لازمی ہوتا تھا۔ جلسے کے دوران میں ایسک وقت ایسا آتا تھا کہ لاٹھی چارج ہوتا تھا اور لوگ بھاگتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھے بھی چوٹیں لگیں لیکن جاتے ضرور تھے۔ پتا نہیں کیا کشش تھی؟

امرتسر میں مولانا خیر الدین کی مسجد سیاسی و مذہبی جلسوں کا مرکز تھی اور وہاں ۵۰ سے ۶۰ ہزار آدمی سما جاتے تھے۔ وہاں ایک بار عطاء اللہ شاہ بخاری تقریر کر رہے تھے۔ اس دوران کہنے لگے لوگ کہتے ہیں شاہ جی، آپ کہاں آ پھنسے ہیں۔ دو ماہ کے لئے باہر ہوتے ہیں اور پھر دو سال کے لئے اندر ہو جاتے ہیں۔ نہ بیوی بچوں میں بیٹھے، نہ دوست احباب کی محفلوں کا مزہ لیا۔ نہ کچھ دائیں بائیں دیکھا۔ آخر آپ کو کیا شوق چڑھ گیا ہے؟ کیوں آپ بار بار جیل کی طرف جانے کے لئے رخ کر لیتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ ایسی باتیں نہ کرو۔

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے

ایسے انداز میں انہوں نے شعر پڑھا کہ میں حیران رہ گیا کہ واقعی اسی دن اور اسی موقع کے لئے یہ شعر کہا گیا تھا۔

میں نے ان حضرات کو قریب سے دیکھا۔ بعض آدمی قریب آ کر اور بڑے ہو گئے لیکن بعض قریب آنے سے اور چھوٹے ہو گئے۔ ایسا لگتا ہے، اسی طرح شخصیات کا بھی صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ بعض آدمی قریب جا کر چھوٹے، بھدے، بدنما اور غلط نظر آنے لگتے ہیں، لیکن بعض درمیانے قسم کے لوگ ہوتے ہیں مگر ان کے قریب جانے سے ان کی شخصیت بہت بڑی اور عظیم ہو جاتی ہے اور وہ واقعی بڑے دکھائی دینے لگتے ہیں۔

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کے ساتھ بڑی محفلیں رہیں کیونکہ ان دنوں امرتسر ادبی و سیاسی سرگرمیوں کا ایک مرکز تھا۔

صوفی تبسم صاحب، امرتسر کے رہنے والے تھے، اور گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھاتے تھے۔ جب چھٹی ہوتی تو وہ امرتسر تشریف لاتے۔ فیض، تاثیر، مولانا عرشی، شیخ حسام الدین، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری سب اکٹھے ہو جاتے۔ بعض اوقات جگر اور جوش آ گئے تو پھر یہ سب مل بیٹھتے۔

دوسرا مرکز شیخ حسام الدین کا گھر تھا۔ یہ دونوں حضرات کشمیری تھے اور کشمیری گھروں میں آتش پرستوں کی طرح چولہا ہمیشہ چڑھا ہی رہتا ہے۔ کباب آ رہے ہیں، باقرخانی، روغنی نان، چاول اور کچھ نہ کچھ ہر

وقت کھانے کے لئے آتا ہی رہتا تھا۔ ان کے ہاں بڑی محفلیں ہوا کرتی تھیں اور یہاں پر اکثر مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ میں انہیں جادو گر سمجھتا تھا کیونکہ میں نے انہیں دو دو لاکھ کے مجمع کو جب چاہا رلاتے اور جب چاہا ہنساتے ہوئے دیکھا تھا۔ جب کبھی میں شیکسپیئر کی لکھی ہوئی انتونی کی تقریر دیکھتا تو سوچا کرتا تھا کہ اگر وہ آج ہوتا تو مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا شاگرد ہوتا۔ ان کی شخصیت اور تقریر کا ایسا اثر تھا کہ عشاء کی نماز کے بعد وہ تقریر کے لئے کھڑے ہوتے تھے۔ پہلے تلاوت کلام پاک کیا کرتے۔ اور تلاوت اتنی اچھی قرأت کے ساتھ کرتے تھے کہ لوگ کہتے، محسوس ہوتا ہے۔ کہ جیسے قرآن نازل ہو رہا ہے۔ بعد ازاں وہ تقریر شروع کرتے اور اذان فجر تک وہ تقریر جاری رہتی۔ اس عرصے کے دوران وہ جب چاہتے لوگوں کو رلا دیتے اور جس وقت چاہتے لوگوں کو ہنسا دیتے۔ ہر تقریر میں ان کے چند فقرے ایسے تاریخی ہوتے تھے کہ جو آج بھی لوگوں کو یاد ہیں مثلاً شاتم رسول ﷺ کے معاملے پر جسے غازی علم الدین نے قتل کر دیا تھا۔ (میں اس وقت بہت چھوٹا تھا مگر آج بھی یاد ہے) کہنے لگے۔ "یہ نہیں ہو سکتا کہ میرے رسول ﷺ کے بارے میں کوئی گستاخی کرے اور وہ زندہ رہے۔ انگریز کے دور حکومت میں یہ بات کہنا کتنی بڑی بے باکی اور جرأت تھی۔ کہنے لگے۔ "یاد رکھو، یا تو گالی دینے والی زبان نہیں رہے گی یا سننے والے کان نہیں رہیں گے۔"

انگریزوں کا ان کے بارے میں خیال تھا کہ یہ شخص جب چاہے دو ڈھائی لاکھ کا مجمع لے کر بغاوت کرا سکتا ہے۔ میں نے انہیں بڑے قریب سے دیکھا اور میں ان سے بہت متاثر تھا، حالانکہ میں خاکسار تھا اور وہ خاکساروں کے سخت مخالف تھے بلکہ میں نے مولانا صاحب کے خلاف خاکسار ہونے کی حیثیت میں ایک نظم بھی لکھی تھی۔

کیونکہ میں مشن کے اعتبار سے پکا خاکسار تھا اور میرا ایمان تھا کہ یہ تحریک انقلاب لائے گی اور مسلمانوں میں تبدیلی پیدا کرے گی۔ میری ان سے جب پہلی ملاقات ہوئی اور میرے وہ شعر انہوں نے سنے تو شیخ حسام الدین سے کہنے لگے۔ "اوئے شیخا! اینہوں لے آ اپنے کیمپ وچ بھئی" (اے شیخ! اسے اپنے کیمپ میں لے آؤ)

انہوں نے کہا۔ "یہ تو پہلے ہی کیمپ میں ہے۔"

مولانا نے سوال کیا "کون سے کیمپ میں ہے؟"

شیخ صاحب نے کہا۔ "مخالف کیمپ میں۔"

مولانا کہنے لگے "کوئی بات نہیں، آدمی کو کسی نہ کسی کیمپ ہونا چاہیئے۔ چاہے مخالف کیمپ ہی کیوں نہ ہو۔"

شیخ صاحب نے مولانا کو بتایا کہ اس نے آپ کے خلاف ایک نظم بھی کہہ رکھی ہے۔

مولانا نے کہا۔ "سناؤ" پھر مجھ سے اپنے خلاف نظم سنی اور اس پر داد دی۔

یہ نظم اس طرح شروع ہوتی تھی کہ۔

وصالِ حُور کا قصہ سُنا کے لُوٹ لیا
عذاب گور کا نقشہ دکھا کے لُوٹ لیا
غریب قوم کو الّو بنا کے لُوٹ لیا
مثالِ فیل اکڑتے ہوئے، لٹکتے ہوئے
عصا زمین پر کس زور سے پٹختے ہوئے
سیاہ زُلف کو انداز سے جھٹکتے ہوئے
رہِ مبین سے ہر گام پہ بھٹکتے ہوئے
قلندروں نے تماشا بنا کے لُوٹ لیا

مجلس احرار کا یہ قصہ تھا اور جب کوئی سیاسی معاملہ ہوتا تھا تو یہ کانگریس کے ساتھ ہوتے تھے مگر مذہبی معاملات میں انفرادی طور پر مسلمانوں کی اعانت کرتے تھے۔ بہر حال اس نظم میں میرا مولانا کے ساتھ گستاخانہ لب ولہجہ تھا جو اچھا نہ تھا، لیکن وہ بہت بڑے اور عظیم لوگ تھے، ہمارا تو اس وقت آغاز ہوا تھا۔ شعر وشاعری میں نئے آئے تھے۔ جذبہ زیادہ تھا، عقل نہیں تھی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہر نیا آنے والا اپنے خیالات اور نظریات میں بڑا متعصب ہوتا ہے۔ اس کے باوجود وہ مجھ سے بالکل بیٹوں کی طرح پیار کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک میٹنگ میں مولانا اپنے ساتھ اپنے بیٹے کو بھی لائے تھے۔ سب سے بڑے فرزند (سید ابو معاویہ ابو ذر بخاری) وہ مجھ سے عمر میں دو سال چھوٹا تھا۔ اسے فارسی کے بے شمار اشعار یاد تھے۔ شاہ صاحب آکر بیٹھے تو پہلے اس سے تعارف کرایا پھر کہنے لگے۔ "یہ سیف ہے، تمہارا بڑا بھائی ہے، اسے سلام کرو۔" پھر کہا۔ "چلو اب قاآنی کا فلاں قصیدہ سناؤ۔"

اس نے فر فر قصیدہ سنانا شروع کیا تو شاہ صاحب کہنے لگے۔ شیخ جی، آپ نے کچھ حساب لگایا؟"

شیخ حسام الدین نے کہا۔ "ہاں، میں سمجھ گیا ہوں۔"

شاہ صاحب کا اشارہ اردو کے ایک شاعر کی طرف تھا جنہوں نے اس قصیدے سے بہت کچھ اخذ کیا ہوا تھا اور یہ قصیدہ ان کے بارے میں ایک ریفرنس تھا۔

میرے والد مولانا کے بہت معتقد تھے انہوں نے جب قادیان میں کانفرنس تین روزہ احرار تبلیغ کانفرنس قادیان کی تو والد صاحب دو تین روز کے لئے وہاں انہیں سننے کے لئے گئے حالانکہ والد صاحب کبھی بھی کہیں نہیں جایا کرتے تھے۔ "یہ ایسا شخص ہے کہ ولی تو کیا اگر یہ اس سے بھی زیادہ دعویٰ کرے تو میں اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

ایک مرتبہ میں اور والد صاحب شیخ حسام الدین کی گلی سے گزر رہے تھے۔ والد صاحب کا یہ حکم تھا کہ غیروں سے تعلقات نہیں رکھتے سوائے اپنے بھائیوں اور کزنز کے، اور اپنی عمر سے بڑے آدمی خواہ نیک

ہوں، فرشتے ہوں ..... سے تعلقات نہیں رکھتے۔

مجھے عطاء اللہ شاہ بخاری "سیف المسرور" کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ تمہارے اشعار بڑے کاٹ دار ہیں۔ ہم جوں ہی گلی کا ایک موڑ مڑے تو سامنے دیکھا کہ شاہ جی "چلے آ رہے ہیں۔ وہ بڑے قوی ہیکل گورے چٹے اور سیاہ لمبے بالوں والے آدمی تھے۔ روشن آنکھیں اور سرخ بُرعب چہرہ، ہاتھ میں بھاری بھرکم عصا ہوتا تھا اور ساتھ میں دو چار آدمی ضرور ہوتے تھے۔ مجھے دیکھا تو دونوں بازو پھیلا دئے اور کہا۔

"او سیف المسرور، ابھی میں شیخ صاحب سے تمہارے بارے میں پوچھ کر آ رہا ہوں۔" مجھے سینے کے ساتھ لپٹا لیا اور ایک آدھ قرآنی آیت پڑھنے کے بعد میرے چہرے پر پھونک ماری۔ میں گھبرا رہا تھا کہ والد صاحب کھڑے ہیں اور وہ پوچھیں گے کہ یہ تمہارا واقف کیسے بن گیا، یہ تو عمر میں مجھ سے بھی بڑا ہے جبکہ میں نے تمہیں کہا ہے کہ اپنی عمر سے بڑے آدمی سے نہ ملا کرو۔

شاہ جی کے وہ بہت معتقد تھے، میں نے ان کا تعارف کرایا کہ یہ میرے والد صاحب ہیں۔

انہوں نے والد صاحب سے کہا۔ "اچھا اچھا، آپ بڑے خوش قسمت آدمی ہیں۔ اللہ نے آپ کو بڑا تحفہ دیا ہے۔ آپ کا بیٹا سیف ہمارا بھی بیٹا ہے۔"

اس کے بعد ہم اپنی اپنی راہ چلے گئے، والد صاحب نے بظاہر تو ظاہر کیا کہ وہ بہت ناراض ہیں لیکن انہوں نے سوچا ہو گا کہ جس شخص کو وہ اتنا بڑا سمجھتے ہیں، وہ بھی ان کے بیٹے کی تعریف کر رہا ہے۔ پوچھنے لگے۔ "بھئی یہ تمہارے کیسے واقف ہیں؟"

وہ اُس مسجد میں نماز پڑھا کرتے تھے جہاں مولانا عرشی امامت کرتے، درس اور خطبہ بھی دیتے تھے۔ اسی لئے میں نے کہا۔ "جی! وہ مولانا عرشی صاحب نے ایک بار بلوایا تھا اور وہاں شاہ جی سے ملاقات ہوئی۔"

کہنے لگے۔ "اچھا ٹھیک ہے۔"

مجھے یاد ہے کہ شاہ جی ایک بار رہا ہو کر آئے۔ میں شیخ حسام الدین کے گھر بیٹھا ہوا تھا، مجھے دیکھا اور کہا! "او سیف المسرور، خدا تمہیں پوچھے"

میں نے کہا "شاہ جی کیا ہوا"

کہنے لگے۔ "تمہاری وجہ سے میں پوری رات جیل میں تڑپتا رہا ہوں اور سو نہیں سکا۔"

میں نے پوچھا "شاہ جی! میرا قصور کیا ہے؟"

کہنے لگے۔ میں جیل میں تھا اور وہاں شیخ آ گیا۔ میں نے اسے کہا کہ کوئی شعر سناؤ تو اس نے تمہارا ایک شعر سنایا۔ وہ شعر یہ تھا۔

تیرے قفس میں جوانی لٹا کے بیٹھ رہے
میرے چمن میں تڑپتی رہی بہار مری

خود ان کی یہ کیفیت تھی کہ ساری عمر قفس ہی میں رہے۔ گھر کے چمن کی بہاریں نہیں دیکھیں۔ بیوی بچوں کے ساتھ آرام سے نہ بیٹھ سکے۔ بس آنا جانا لگا رہتا تھا۔ یا تو تقریریں کرنے چلے جایا کرتے تھے یا پھر کبھی کلکتہ، بمبئی، دہلی، لکھنو، پشاور، پنڈی، لاہور میں ہیں یا پھر جیل میں ہیں۔ کبھی عدالت میں مقدمہ چل رہا ہے تو وہاں پر ہیں۔ اس لئے کہنے لگے۔ جب یہ شعر سنا تو ساری رات سیف، یقین کرو میں سلاخوں کے ساتھ سر پٹختا رہا ہوں۔"

میں نے بتایا کہ وہ مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے۔ میں خوش نصیب ہوں کہ مجھے ان لوگوں کی صحبت حاصل رہی اور میں نے ان کی محفلوں میں شرکت کی۔ ورنہ لاکھوں ایسے انسان تھے کہ جنھوں نے انہیں قریب سے دیکھا تک نہیں مگر وہ مجھ سے بے حد محبت سے ملتے تھے۔ میں جب کبھی اس بارے میں سوچتا ہوں تو بہت خوش ہوتا ہوں اور خود کو خوش نصیب سمجھتا ہوں۔

شیخ حسام الدین بھی بہت بڑے لیڈر تھے مگر شاہ جی کی شخصیت اتنی نمایاں تھی کہ احرار کے باقی لیڈروں کے قدان کی موجودگی میں چھوٹے ہو جایا کرتے تھے۔

بہادر یار جنگ کا اسلوب اور تھا جبکہ شاہ جی کا انداز مختلف تھا۔ وہ درویش تھے۔ یہ لوگ تو پیدا ہی قربان ہونے کے لئے ہوئے تھے۔ وہ لوگ کہ جنہیں ماں کی گھٹی میں آزادی کی تعلیم ملتی ہے اور وہ ان کے خون میں سرایت کر جاتی ہے۔ وہ تو انگریز کی غلامی کو برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے اور کہتے تھے۔ مسلمان ہونا اور غلام ہونا یہ دو متضاد چیزیں ہیں۔ جس وقت تک میں آزاد نہیں ہوں، مسلمان نہیں ہوں۔ شاہ جی انگریز کے اتنے سخت خلاف تھے کہ کہتے تھے "تمام عالم اسلام میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا ذمے دار انگریز ہے، اس لئے انگریز کو یہاں سے نکال پھینکو۔" اس لئے وہ ایسے مواقع پر انگریز کی مخالفت پر کانگریس سے اتحاد کر لیا کرتے تھے، لیکن جب مسلمانوں کے مفاد کا معاملہ ہوتا تھا تو پھر وہ سمجھوتا نہیں کرتے تھے۔

مجلس احرار والے ..... اس قسم کے لوگ تھے جنھوں نے انگریزوں سے لڑائی کی تھی۔ پندرہ سال تک جیلیں کاٹی تھیں، وہ اس وقت غلطی کر گئے۔ انہیں علم نہ ہو سکا کہ آنے والا وقت کیا ہے؟ اگر وہ اس قومی دھارے میں شامل ہو جاتے تو آج قوم کی حالت کچھ اور ہوتی۔ اب اگر اقتدار میں نون، چھٹے، دولتانے، ٹوانے اور خضر حیاتی آجائیں تو پھر یہی کچھ ہوتا ہے۔ گاؤں دیہاتوں میں جہاں ان کی عمل داریاں ہیں۔ وہاں جا کر دیکھیں تو حیرت ہوتی ہے کہ جنگل کا راج ہے اور کوئی آدمی ان کے خلاف بول نہیں سکتا اور یہ سب کچھ اس ترقی یافتہ دور میں ہو رہا ہے۔ اس طرح آپ تھانے چلے جائیں، قتل کروانا ہو، کسی کی پٹائی کروانی ہو یا کسی کو مکان سے بے دخل کرنا ہو، تھانوں میں ہر چیز کا سودا ہوتا ہے۔ میں یہ سُنی سنائی باتیں نہیں کر رہا بلکہ میرا بڑا قریب سے مشاہدہ ہے اور میں نے اپنے کانوں سے لوگوں کو یہ باتیں کرتے سنا ہے۔

آدمی کو جب اپنے حقوق کا شعور ہو جاتا ہے تو وہ اس کے لئے لڑتا ہے۔ ابھی تک لوگوں کو اسکا شعور